ڈاکٹر اعجاز نسیم، فورٹ عباس، (بہاول نگر)
ڈاکٹر احمد حسین ہادی، ٹیکساس، (امریکہ)
Dr. Ijaz Naseem, Fort Abbas, (Bahawal Nagar).
Dr. Ahmad Hussain Haady, Texas, (USA).

بہاول پور میں اُردو ناولوں کے رجحانات کا تجزیاتی مطالعہ

AN ANALYTICAL STUDY OF TRENDS IN URDU NOVELS IN BAHAWAL PUR

Abstract:
Trends and techniques have a fundamental position in fictional literature. From the beginning of Universe until the recent past, literature has developed under the influence of different trends. Be it the movement of Sufis, or the movement of Fort William College, the rationalism of Sir Syed or the psychological and Be it the Marxist movement, the progressive movement or the theory of existence, or after the establishment of Pakistan, trends like modernism emerged which directly or indirectly influenced literature. Even the novelists living in land of Bahawalpur could not remain safe from the changing global scenario. In this research paper, an analytical study of Urdu novels of Bahawalpur is presented. How the changing global scenario affected the literature of Bahawalpur.

***Key Words**: Trends, Novels, Bahawal Pur, Changing Global Scenario, Affected the Literature.*

تاریخ اردو ادب کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ دنیا کی ابتداء سے لے کے ماضی قریب تک اردو ادب مختلف رجحانات اور تحریکوں کے زیر اثر پروان چڑھتا آیا ہے۔ وہ صوفیاء کی تحریک ہو یا فورٹ ولیم کالج کی تحریک، سرسید احمد خان کی تعقل پسندی کی تحریک ہو یا ترقی پسند تحریک، ان سب رجحانات نے کسی نہ کسی انداز میں ادب کو متاثر کیا۔

بیسویں صدی اردو ادب کی صدی تسلیم کی جاتی ہے ۔جس میں مختلف تحریکیں اور رجحانات سامنے آئے۔ جیسے رومانوی، نفسیاتی، مارکسی، ترقی پسند تحریک، وجودیت اور قیام پاکستان کے بعد جدیدیت کے رجحانات نے ادب میں اہم کردار ادا کیا۔

افسانوی ادب میں ناول کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں زندگی کی مکمل ترجمانی کی جاتی ہے۔یہ صنف ادب مختلف رجحانات کا اثر قبول کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف حادثات،واقعات، مسائل اور معاملات کو تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

برصغیر میں اردو ناول کا آغاز اس وقت ہوا جب ہندوستان کی سماجی،سیاسی، تعلیمی اور تہذیبی زندگی میں مختلف تبدیلیاں اور رجحانات شامل ہو چکے تھے۔اس لیے مختلف ادیبوں اور دانشوروں نے ادب کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کا کام کیا۔ اس سے پہلے اردو داستان جو رومانوی اور تخیلاتی راستے کی مسافر تھی، انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں حقیقت پسندی کے رجحان کو اپنایا۔ اس طرح ناول کو جو انگریزی زبان و ادب سے ہمارے ہاں آیا ،دیکھتے ہی دیکھتے مختلف رجحانات کے زیر اثر پروان چڑھنے لگا۔

ناول لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ برصغیر میں اردو ناول کا آغاز دور غلامی سے ہوا، جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمانوں کے زوال اور انگریزوں کے اقتدار کی آمد کا دور تھا۔ خارجی اور باطنی سطح پر ہونے والے انتشار کے اثرات ادب پر بھی پڑے ۔جس کی وجہ سے ادب میں نئی راہیں استوار ہوئیں۔ڈاکٹر سہیل بخاری اس کی یوں وضاحت کرتے ہیں۔

> ’’برصغیر میں اردو ناول کا آغاز دور غلامی سے ہوا۔یہ وہی عہد تھاجب ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمان زوال کا شکار ہوئے اور انگریزوں کا باقاعدہ اقتدار قائم ہو گیا تھا۔خارجی اور باطنی سطح پر ہونے والے انتشار کے اثرات ادب پر بھی پڑے"(۱)

اردو ناول اپنے آغاز سے لے کر اب تک موضوعات اور تکنیک کے اعتبار سے جس قسم کے تجربات اور رجحانات سے دوچار ہوا ،ان میں سب سے پہلا رجحان اصلاحی تھا ۔جس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں سماجی، سیاسی، معاشی اور دیگر خارجی اور داخلی پہلوؤں کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ان ناول نگاروں میں ڈپٹی نذیر احمد، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور علامہ راشدالخیری کے نام زیادہ اہم ہیں۔ اس کے بعد اردو میں عبدالحلیم شرر، نے تاریخی رجحان کو فروغ دیا اور وہ تاریخی ناول نگاری کے موجد قرار پائے۔اس کے بعد تقلید کا دور شروع ہوتا ہے۔ان میں علامہ راشدالخیری، منشی سجاد حسین اور مرزا محمد ہادی رسوا

نے بہترین ناول لکھے۔ "امراو جان ادا" اس دور کا بہترین ناول ہے، جس میں ایک مخصوص عہد کی تہذیب اور معاشرت کو بیان کیا گیا ہے۔یوسف سرمست لکھتے ہیں:

> "امراوجان ادا ایک ایسا ناول ہے جس میں انھوں نے جی لگا کر لکھا تھا اور بار بار اصرار کیا کہ یہ ناول حقیقت پر مبنی ہے۔امراو جان ادا سے ان کی ملاقات ہوئی اور یہ کہانی خود امراو جان ادا نے انھیں سنائی۔"(۲)

بیسویں صدی میں ہندوستان میں کئی ہنگامے سر اٹھا رہے تھے۔انیس سو چودہ میں پہلی جنگ عظیم نے جنم لیا۔۱۹۱۷ء میں انقلاب روس کی وجہ سے پوری دنیا متاثر ہوئی۔ہندوستانی عوام میں آزادی کی جدوجہد شروع ہوگئی۔ مارکسی نظریات نے ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کرلی۔۱۹۳۶ء میں ہندوستان میں یہ تحریک"ترقی پسند تحریک" کی شکل میں مشہور ہوئی۔اس نے اردو ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔چنانچہ اس تحریک سے وابستہ ادیبوں نے بڑے زور و شور سے ان افکار و نظریات کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔

دیکھا جائے تو موضوعات کے حوالے سے ناول نے کئی فکری موڑ کاٹے ہیں اور مختلف رجحانات کے مطابق پروان چڑھتا آیا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد سے سرشار، شرر، مرزا ہادی رسوا ،پریم چند اور سجاد ظہیر کی تخلیقات کے ساتھ ساتھ بے شمار موضوعات پر قلم اٹھایا اور مختلف فکری رجحانات کی بدولت لوگوں کو متاثر کیا ۔اس میں تاریخ ،وقت کا جبر، سماجی سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی مسائل، ہجرت، مذہبی فکر، روحانی کرب، بار بار اجڑنے اور بسنے کے علاوہ بے شمار داخلی و خارجی مسائل جیسے موضوعات کو شامل کیا ہے۔

علم و ادب کے حوالے سے بہاول پور کی سرزمین بڑی زرخیز ہے۔انیسویں صدی کے آغاز سے ہی یہاں نثر لکھنے کا رواج ہوا۔مراد شاہ لاہوری، مولوی عبد العزیز، عبد القدوس قدسی، مولوی شمس الدین، کیپٹن مینچن اور اشرف گورگانی نے بہاول پور میں اردو نثر کو فروغ دیا۔

قیام پاکستان کے بعد یہاں کی ادبی فضا میں خوشگوار تبدیلی آئی۔ ہندوستان کے مختلف خطوں سے تعلق رکھنے والے شعراء و ادباء نے بہاول پور کو مستقل سکونت کے لئے منتخب کیا۔ڈاکٹر خالد اشرف اس بارے میں لکھتے ہیں:

"تقسیم ہند کے بعد اس طبقے کی زندگی یک بیک تبدیل ہو جاتی ہے ۔ جاگیر داری نظام کا خاتمہ، ہندو مسلم بھائی چارے کا انقطاع، بے گھر و بے سامان ہونے کا سانحہ اور ذرائع آمدنی کا خاتمہ وغیرہ مل کر ان کو بری طرح پست کر دیتے ہیں کہ یہ نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے میں خود کو ناکام پاتے ہیں۔اور اپنی سر زمین چھوڑ کر پاکستان کی طرف فرار ہونے کا راستہ تلاش کرتے ہیں اس طرح صدیوں پرانی سیکولر اقدار اور مذہبی رواداری کا خاتمہ ہوتا ہے۔"(۳)

آزادی کی صبح روشن اور نئے تصورات و خیالات اردو ادب کا حصہ بنے۔ادب میں مختلف تکنیکس اور رجحانات جیسے تقسیم ہند کے معاشرے پر اثرات، جاگیر داری نظام کے معاشرے پر اثرات، مزاح نگاری، تمثیل نگاری، نثر میں شعری زبان کا استعمال، جدیدیت اور مابعد جدیدیت نے اردو نثر کو فروغ بخشا اور مختلف رجحانات کے زیر اثر بہت سے ناول تخلیقہوئے۔ جن میں محمد خالد اختر، جمیلہ ہاشمی، ذکاء الرحمن، بشریٰ رحمن، سید جاوید اختر، امجد جاوید اور کئی دوسرے ناول نگار منظر عام پر آئے، جنھوں نے ان رجحانات کا گہرا اثر قبول کیا اور انھیں اپنے ناولوں کا حصہ بنایا ان رجحانات کی تفصیل درج ذیل ہے۔

اردو ناولوں میں سماجی رجحان:

ادب اور سماج آپسمیں لازم و ملزوم ہیں۔ ادب اتنا ہی قدیم ہے جتنا سماج۔ انسان کے بغیر سماج کا تصور ممکن نہیں۔ سماج ایسے رشتوں سے بنتا ہے، جو انسانوں کو آپس میں جوڑے رکھتے ہیں۔ سماج مختلف اقدار کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جب یہ اقدار شکست وریخت کا شکار ہو جائیں، تب سماج بھی اس سے اثر قبول کرے گا۔ اقدار کی یہ تبدیلی سماج کے تغیر سے تعبیر ہوتی ہے، اور سماج میں فرد کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ہر فرد اپنے سماج کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔ادب بھی اس سماج کا حصہ ہے۔ سماج جن اقدار سے وابستہ ہوتا ہے، ایک ادیب بھی ان اقدار کا اثر قبول کرتا ہے، لیکن ایک ادیب کا معاشرتی اقدار کو قبول کرنے کا انداز عام آدمی سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ادب میں زندگی کی جھلک واضح نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر محمد خاں اشرف لکھتے ہیں:

"ادب زندگی کا حصہ ہے۔ یہ ایک معاشرتی مظہر ہے۔لہٰذا ادب اور سماج میں تقسیم بے معنی ہے۔ادب زندہ لوگوں کی تخلیق ہے۔ ادب ہمیشہ سے انسانی معاشرے کا حصہ رہا ہے اور اس

نے لوگوں کو ہمیشہ مسرت کے ساتھ ایک نئی بصیرت بھی دی ہے اور فنکارانہ استعجاب سے بھی ہم کنار کیا ہے۔"(۴)

بہاول پور خطہ اپنی سماجی و تہذیبی روایت کی وجہ سے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ جہاں مختلف ادیبوں نے ان اقدار کو ادب کا حصہ بنایا۔ ان تمام اقدار کا احاطہ کیا، جن سے تمام انسانوں کو واسطہ پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں محمد خالد اختر ہو یا جمیلہ ہاشمی، امجد جاوید ہو یا عمران اقبال، اس دھرتی سے وابستہ ہر ناول نگار نے سماجی اقدار کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اطہر پرویز لکھتے ہیں:

"تقسیم ہندوستان کے بعد بہاول پور کی ادبی فضا میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مختلف علاقوں سے ادب سے تعلق رکھنے والوں نے مستقل طور پر ریاست بہاول پور میں رہائش اختیار کی۔ انھوں نے ادبی جمود کو توڑا، جو تقسیم سے پہلے یہاں کی فضا پر طاری تھا، جس سے جدید رجحانات کو فروغ ملا۔"(۵)

اس خطہ سرزمین سے تعلق رکھنے والے بیشتر ادیبوں نے اپنے ناولوں میں نہ صرف بہاول پور اور اس کے ارد گرد کے ماحول کی عکاسی کی ہے بلکہ روزمرہ زندگی میں عام آدمی کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کے علاوہ اس معاشرے میں عورت کے استحصال، شک کی بنیاد پر رشتوں کی پامالی، جاگیرداری نظام کی خامیاں، معاشرتی کج رویوں، بے اعتدالیوں اور وٹہ سٹہ جیسی رسومات کو بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں جمیلہ ہاشمی کے ناول تلاش بہاراں، داغ فراق بشریٰ رحمن کے ناول لگن، خوبصورت، تیرے سنگ در کی تلاش تھی، پیاسی، دانہ رسوئی، شفیق احمد کا ناول "دیا جلتا رہا" نجم الدین احمد کے ناول سہیم، کھوج، اور "مدفن" عمران اقبال کا ناول "لندن کی وہ شام" اور امیر عجم ملک کے ناول "سرد معبد" اور "قم گوتم" بہترین ناول ہیں۔

بشریٰ رحمن نے انسانی قدروں کے زوال کے علاوہ عورت کی ناکامیوں اور نامرادیوں کا ذمہ دار مرد کو نہیں بلکہ عورت کو ٹھہرایا ہے وہ عورت جو اس معاشرے کو سنوارنے میں اپنی زندگی بسر کر دیتی ہے، لیکن جب اس کے اپنے حقوق کی باری آتی ہے تو یہ نام نہاد معاشرہ یوں آنکھیں پھیر لیتا ہے جیسے اس رشتے سے ان کا کوئی واسطہ نہ ہو۔ ان کی کہانیاں زندگی کے مختلف پہلوؤں، زندگی کے نشیب و فراز، اس کے دکھ سکھ اور عورتوں کی بے بسی، سماج میں انہیں ان کا جائز مقام نہ ملنا جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ خواہ ان کا ناول "پیاسی" ہو یا "بہشت" "تیرے سنگ در کی تلاش تھی یا دانا رسوئی، سب میں عورت کی بے بسی نظر آتی ہے۔

''تیرے سنگ در کی تلاش تھی'' ناول کی مرکزی کردار تسبیحہ کو علم حاصل کرنے کی چاہت تھی۔ باپ نے بھی اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے دست شفقت اس پر رکھا۔وہ تسبیحہ کو ڈاکٹر بنتے دیکھنا چاہتے تھے اور پھر تسبیحہ پی ایچ ڈی کرنے کے لیے آکسفورڈ یونیورسٹی لندن چلی گئی۔جہاں سے اس کی علمیت اور خود داری کو ایک پاکستانی مرد وجیہہ نے دیکھا ،جو اپنی امریکی بیوی کے ساتھ تھا۔تسبیحہ سے تھوڑی دیر اس کی گفتگو ہوئی۔ تسبیحہ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد پاکستان آ گئی اور ایک پرائیویٹ کالج کی پرنسپل بنی۔لندن میں جس صحافی نے اسے دیکھا وہ بعد میں پاکستان آیا اور تسبیحہ کو اپنے پیار کے شیشے میں اتارا، لیکن موقع ملتے ہی تسبیحہ سے شادی کرنے کے بعد اسے اور اس کے بچوں کو دھوکہ دے کر لندن چلا گیا۔مگر زندگی نے اس کے ساتھ وفا نہ کی اور وہ جلد کینسر میں مبتلا ہو کر مر گیا۔

''سہیم'' نجم الدین احمد کا ناول ہے۔ جس میں ایک ایسی حقیقت سے پردہ چاک کیا گیا ہے جہاں بیٹیوں کو رحمت سمجھنے کی بجائے زحمت تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں بیٹیوں کو وراثت میں حق دار بننے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیختم کر دیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس ناول میں جاگیرداری نظام کے معاشرے پر اثرات کا تذکرہ بھی ہے کہ یہاں جاگیر کی تقسیم کے خوف سے یا تو بچیوں کو ماں کے پیٹ سے نکلتے ہی ختم کر دیا جاتا ہے یا پھر جوان ہونے کے بعد اس کی شادی قرآن سے کر دی جاتی ہے تاکہ جاگیر تقسیم نہ ہو سکے۔

اس ناول میں ایسے جاگیردار خاندان کی کہانی بیان ہوئی ہے جو بیٹیوں کو رحمت سمجھنے کی بجائے زحمت سمجھتے ہیں۔ اس خاندان کے بچوں کی پیدائش کرنے کے لیے ایک مخصوص دائی سرداراں کو حکم صادر کیا گیا کہ اگر لڑکا ہو تو صحیح سلامت زندہ رہے، اگر لڑکی ہو تو پیدائش کے وقت ہی اسے موت کے گھاٹ اتار دے۔معلوم نہیں دائی سرداراں کتنی بچیوں کے لئے جلاد ثابت ہوئی ہوگی۔ مصنف لکھتے ہیں:

> ''بیٹی تو انہوں نے کوئی زندہ نہیں رہنے دی تھی سرداراں دائی کو حکم تھا کہ بیٹا جنم لے تو ٹھیک، بیٹی دوسرا سانس نہ لینے پائے ورنہ وہ اور اس کا خاندان دوسرا سانس نہیں لے پائے گا۔''(۶)

نفسیاتی رجحان:

نفسیات سے ادب کا رشتہ استوار ہونے کی وجہ بیسویں صدی کے وہ سماجی حالات ہیں۔ جس نے انسانی زندگیوں کو بہت زیادہ متاثر کیا اور انسان مختلف بحرانوں کا شکار ہو گیا۔مادہ پرستی کا وہ دور سرمایہ دارانہ نظام کا پیش خیمہ ثابت ہوا، جس سے افراد ذاتیات اور سماجیات کی چکی میں پسنے لگے۔ جس کی وجہ سے اس دور کا انسان مختلف نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو گیا۔ اس دور کا انسان اپنی داخلی شخصیت کی بازیافت کے کھوج میں بھٹکتا پھر تا ہے۔ یہ تمام نفسیاتی مسائل جو ذہنی انتشار اور کرب کا نتیجہ تھے فرد کے لئے ناقابل برداشت ہوتے گئے اور انسان ان کے تدارک کی کوشش میں لگا رہا اور افراد کی نفسیاتی الجھنوں اور مختلف مسائل کے حل کی کوشش کرنے لگا۔

بہاول پور میں نفسیاتی رجحان کے حوالے سے اردو ناولوں کا مطالعہ کیا جائے تو بیشتر ناول نگاروں نے نفسیاتی الجھنوں اور جنسی مسائل کو سامنے لانے کی بھرپور کوششیں کیں. ان مصنفین نے مختلف اصناف ادب میں نفسیاتی مواد ،نفسیاتی مسائل کا کھوج اور کرداروں کی تحلیل نفسی کے ذریعے تجزیہ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ان ناول نگاروں میں محمد خالد اختر کا ناول "بیس سو گیارہ" جمیلہ ہاشمی کے ناول "تلاش بہاراں" اور "اپنا اپنا جہنم" بشریٰ رحمان کا ناول "خوب صورت" ذکاء الرحمن کا ناول "دود چراغ محفل" سید جاوید اختر کا ناولٹ "ایک شاخ تمنا" اور نجم الدین احمد کا ناول "مدفن" خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

مدفن میں معاشرے کے ایسے کرداروں کو موضوع بنایا ہے جو اپنے جذبات اور خیالات کا دوسروں کے ساتھ تبادلہ چاہتے ہیں، لیکن وہ غیر یقینی کیفیت میں مبتلا ہوتے ہیں اور محبت میں تقسیم کے ڈر سے اپنی اندرونی کیفیات کا کسی سے اظہار نہیں کرتے۔ وہ نہیں چاہتے. کہ ان کے اندرونی خوف کا کسی کو علم ہو۔ وہ دوسروں سے اظہار خیال نہ ہونے کی وجہ سے اندر ہی اندر مختلف نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔۔اس ناول کی مرکزی کردار نازیہ اپنی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کے لیے سرگرداں رہتی ہے۔ کسی بھی خواہش کے مکمل نہ ہونے کو ایک قبر سے تعبیر کرتی ہے۔ مصنف نے نازیہ کے خیالات کی یوں عکاسی کی ہے۔

> "میری پشت پر چھوٹی چھوٹی ناآسودہ خواہشوں کی اور بھی بہت سی قبریں ہیں۔ میں بھی دوسری بے شمار عورتوں کی طرح شائد سمجھوتے کی زندگی بسر کرتی، مگر ان کے برعکس ایک دن کسی نازک لمحے کے بیچ میری توجہ اس قبرستان کی طرف ہو گئی۔ یہ قبرستان ہر عورت کی پشت پر ہوتا ہے۔ وہ اس میں مدفون خواہشات اور کیفیات کو پکارنے کی آوازیں بھی سنتی

ہیں، لیکن ان کی جانب توجہ نہیں کرتیں۔ اور جو متوجہ ہو جاتی ہیں، وہ میری طرح ۔۔۔۔میں نے جب ان پر نظر کی تو ہر قبر میں میری کسی حسین کیفیت کی، کسی خوب صورت تمنا کی روح بے قراری اور ناآسودگی کی تڑپ میں مبتلا تھی۔"(۷)

تخیلاتی اور مزاح کا رجحان:

محمد خالد اختر مزاح اور نگارش کے ایک نئے طرز کا موجد ہے۔ جس نے تخیلاتی انداز اپناتے ہوئے فینٹیسی کے روپ میں کہانیاں لکھیں۔ ان کا ناول " بیس سو گیارہ" اور "چاکی واڑہ میں وصال" فنٹیسی کے انداز میں لکھے گئے ناول ہیں۔ جس میں تخیلاتی اور مزاحیہ انداز اختیار کرتے ہوئے لکھا گیا ہے۔ "بیس سو گیارہ" ناول کی کہانی ماضنین کی ایک خیالی ریاست "یوکناپوٹاواہا" کے صدر کے ایک دوسری ریاست ماضنین کے دورے کی کہانی ہے، جس میں انھوں نے موجودہ دور کے مطابق معاشرتی کج رویوں، مادہ پرستی کی اندھی تقلید، معاشرتی، اخلاقی اور تہذیبی اقدار کی گراوٹ اور انسان اور انسانیت کی تذلیل کرنے والے معاشرے کی طنز و مزاح کے انداز میں نشاندہی کی ہے۔

"چاکی واڑہ میں وصال" کراچی کے محلے چاکی واڑہ کی کہانی ہے۔ جہاں مصنف نے زندگی کا کچھ عرصہ گزارا اور وہاں کی تہذیب و ثقافت کو مزاح کے روپ میں پیش کیا۔ اس ناول کی اصل خوبی یہ ہے کہ مصنف نے اردو ادب کو دو دلچسپ کردار دیے ہیں۔ چچا عبدالباقی المعروف شیخ قربان علی گٹار گوجرانوالوی اور بھتیجا بختیار خلجی المعروف مسٹر چنگیزی مالک اللہ توکل بیکری کے روپ میں جلوہ گر ہیں۔ اگرچہ یہ تمام فرضی کردار ہیں جن کا حقیقت سے تعلق نہیں، اس کے باوجود ایسے کئی کردار ہمیں اپنے اردگرد سفر کرتے محسوس ہوتے ہیں۔

محمد خالد اختر اپنی سیلانی طبیعت کے باعث ہمیشہ نئی دنیا کے متلاشی رہے۔ جہاں بھی گئے وہاں کے ماحول، مناظر، فضا اور مقامی اثرات کو بڑی خوبصورتی سے اپنی کہانیوں کا حصہ بنایا۔ ناول چاکی واڑہ میں وصال لوگوں کے رہن سہن، زبان، لہجے کی ادائیگی اور ان کی تہذیب و ثقافت کے بیان میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور مصنف کی عمیق نظری ہر واقع کی چشم دید گواہ محسوس ہوتی ہے۔ اس کی ٹریٹ مینٹ میں مصنف نے نہایت عمدگی سے کام لیا ہے ۔اشفاق احمد ورک بیان کرتے ہیں:

''تیرہ چودہ سال پہلے کی بات ہے جب ایک محفل میں فیض صاحب نے کہا، بھئی ہم کو محمد خالد اختر کی تحریر پسند ہے اور ہم تو" چاکی واڑہ میں وصال،، کو اردو کا عظیم ناول سمجھتے ہیں۔''(۸)

رومانوی رجحان:

محبت ایک لافانی جذبہ ہے کیونکہ ازل سے اس کائنات کا وجود محبت کے خمیر سے گوندھ کا تخلیق کیا گیا۔یہ ایک فطری جذبہ ہے جو انسانی زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔جو کسی بھی لالچ،ہوس اور بدعنوانی کے بغیر صرف خلوص کی بنیاد پر پرورش پاتا ہے۔یہ لازوال جذبہ کسی ملن کا محتاج نہیں ہوتا،صرف محبوب کا دیدار ہی زندگی کا سہارا بن جاتا ہے۔

رومان ادب میں ایک ایسا رجحان ہے جس پر تقریبا ہر مصنف نے لکھا۔جمیلہ ہاشمی کا ناول'' تلاش بہاراں''بشری رحمن کے ناول'' پیاسی'' اور''لازوال'' محمود ظفر اقبال ہاشمی کے ناول''اندھیرے میں جگنو'' ''سفید گلاب''اور'' قلم، قرطاس اور قندیل'' شفیق احمد کا ناول''دیا جلتا رہا'' عمران اقبال کا ناول'' لندن کی وہ شام'' امیر عجم ملک کے ناول''سر د معبد'' اور''قم گوتم'' صائمہ اکرم چوہدری کے ناول'' دیمک زدہ محبت''،'' ابن آدم''،''گم شدہ محبت'' اور'' بند مٹھی میں سلگتی ریت'' اور امجد جاوید کے ناول'' عشق کا قاف''،''عشق فنا ہے عشق بقاء''،'' عشق سیڑھی کانچ کی''،''فیض عشق''،'' عشق کسی کی ذات نہیں''،"عشق کا شین" اور'' جب عشق سمندر اوڑھ لیا'' سب رومانوی رجحان کے نمائندہ ناول ہیں۔

ان تمام مصنفین نے اپنے ناولوں میں محبت اور اس کے مجازی و حقیقی رنگوں اور رویوں کو گہرائی اور سچائی کے ساتھ موضوع بنایا ہے۔وہ اس حقیقت سے پردہ اٹھانا چاہتے ہیں کہ محبت اپنی پوری شدت اور سچائی کے ساتھ سوچ میں بھی ہو اور عمل میں بھی ہو تو انسانی روح کائنات کے سفر پر آمادہ ہو جاتی ہے۔وہ خالص جذبہ جو ذات، پات اور مذہب کی بجائے دل کی گہرائیوں سے تعلق رکھتا ہے۔

اس سلسلے میں شفیق احمد کا ناول "دیا جلتا رہا،، ایک اہم ناول ہے. جس میں محبت کی ایک لازوال داستان بیان ہوئی ہے جو رجی جٹی، شریف،ڈاکٹر جاوید اختر چیمہ اور ظہراں کے گرد گھومتی ہے۔رجی جٹی تقسیم ہندوستان کے دوران اپنے ہندو پڑوسیوں کے عتاب کا شکار ہوتی ہے جو اس کی جان، مال اور عزت سبھی لوٹ لیتے ہیں اور اسے قتل کر دیتے ہیں۔

امجد جاوید کا ناول "امرت کور،، عشق و محبت کی ایک داستان ہے جس کی کہانی امرت کور اور نور محمد کے گرد گھومتی ہے۔ دونوں کا تعلق امرتسر کے پسماندہ گاؤں جتھوال سے ہے۔ امرت کور سکھ گھرانے سے تعلق رکھتی ہے جبکہ نور محمد مسلمان گھرانے سے۔ امرت کور نور محمد کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے اور نور محمد کی محبت پانے کے لیے اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔

دوسری طرف امرت کور کی منگنی اس کے چچا کے بیٹے رگھبیر سنگھ سے ہو جاتی ہے۔ فسادات کی رات امرت کور رگھبیر سنگھ کو قتل کر دیتی ہے، جب کہ ہندوستان کی تقسیم کا سانحہ نور محمد کو ہجرت پر مجبور کرتا ہے اور وہ ہجرت کر کے ہندوستان سے پاکستان آ جاتا ہے۔ اور امرت کور ہندوستان رہ جاتی ہے۔ اس جدائی کے دکھ میں امرت کور گوشہ عزلت اختیار کر لیتی ہے۔

امرت کور مجازی محبت اپنے خدا سے مانگتی ہے تو وہ اپنے محبوب کو مانگتے مانگتے محبوب حقیقی کی طلب گار ہو جاتی ہے۔ امرت کور ابتداء میں تذبذب کا شکار ہوتی ہے، لیکن بعد میں اسے عشق حقیقی کا عرفان حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنے محبوب کی یکتائی کی تلاش میں اپنی عمر گزار دیتی ہے۔ عشق مجازی کو پانے کے لئے اس کی محنت اور تگ و دو اس کو ازلی حقیقت کی طرف مائل کرتی ہے۔ نور محمد جب محبت کا تذکرہ کرتا ہے تو وہ امرت کور کی محبت اور باطن کی سچائیسے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

رومانوی رجحان کے بارے میں امیر عجم ملک کا انداز باقی تمام ناول نگاروں سے انفرادیت کا حامل ہے۔ ان کے نزدیک محبت سب سے حسین جذبہ ہے، جو دنیاوی ہوس سے پاک ہوتا ہے۔ یہ ایک غیر مرئی جذبہ ہے، جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے چھوا نہیں جا سکتا، کیونکہ محبت جس من میں سما جائے، اس میں اپنی ذات کا تصور ختم کر دیتی ہے۔ اسی محبت کا اظہار امیر عجم ملک نے اپنے ناولوں ''سرد معبد'' اور ''قم گوتم'' میں کیا ہے۔ ''سرد معبد'' میں اسد اور ڈاکٹر عمل، جب کہ ''قم گوتم'' میں ریحان اور عشنا کی داستان کا تذکرہ ہے۔ دونوں ناولوں کے ہیروز کا تعلق نہ صرف بہاول پور سے تھا بلکہ دونوں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے طالب علم بھی رہے۔ جب کہ دونوں ناولوں کے زنانہ کرداروں کا تعلق کسی نہ کسی طرح یورپ سے رہا۔ اس طرح مصنف نے دو تہذیبوں کے باہمی ملاپ کو بھی بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر عمل نے امریکہ سے سائیکاٹری کی تعلیم حاصل کی اور عشنا فرانس کی رہائشی تھی۔ وہ سیاحت کے لئے پاکستان آئی اور ریحان سے ملاقات ہو گئی۔ عشنا نے واشگاف انداز میں ریحان سے اظہار محبت کر لیا لیکن اسے پا نہ سکی، جبکہ ڈاکٹر عمل بھی اسد سے محبت کرتی تھی لیکن کھل کر اظہار نہ کر سکی۔ جدائی دونوں کا مقدر تھا۔ لیکن دونوں

کا جذبہ انتہائی بلند تھا۔ ان کی محبت میں کہیں بھی ہوس کا شائبہ تک نہ تھا۔ اسد جب اعلیٰ تعلیم کے لئے فرینکفرٹ گیا تو سفر کے دوران اسے یادوں نے آگھیرا۔ کبھی وہ ڈاکٹر عمل کے ساتھ گزرے ہوئے ایک ایک لمحے کو یاد کرتا تو کبھی اپنی ماں سے جدائی کے تصور کو ان لفظوں میں بیان کرتا ہے۔

> ”محبت اگر حد سے گزر جائے تو الہام بن جاتی ہے۔ میری اپنی ماں کی ذات سے محبت بھی شائد ایک الہام کی مانند تھی ۔میری ماں کے وجود سے ایک انجانی سی خوشبو آتی ہے۔جو مجھ سے اس وقت دور ہو گئی جب میں کھلونوں سے بہل جایا کرتا تھا،،(٩)

فسادات اور ہجرت کا رجحان:

ہجرت و فسادات ایک ایسا موضوع ہے جس سے کوئی بھی خطہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ قیام پاکستان کے بعد انسانیت سوز زواقعات کا رونما ہونا ایک عام سی بات تھی۔ ہر طرف خون کی ہولی کھیلی گئی اور لوگوں کو بلا وجہ ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا، پھر ہجرت کے مسائل ایک اور بڑا المیہ تھا۔ جس نے کئی تہذیبوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہجرت جیسے موضوعات نے ہمارے ادب اور ادیبوں کو بہت متاثر کیا اور اپنے اپنے دور میں ان موضوعات پر ادب تخلیق ہوا۔ ایم اسلم کا ناول ” رقص ابلیس،،نسیم حجازی کا ناول ” خاک وخون“ فکر تونسوی کا ناول ”چھٹا دریا“ قدرت اللہ شہاب کا ناولٹ ” یا خدا“ خدیجہ مستور کا ناول ” آنگن“ وہ مشہور ناول ہیں، جن میں انسان اور انسانیت پر بربریت اور ظلم و ستم کی داستانیں رقم ہوئی ہیں۔

خطہ بہاول پور کی جنوب مشرقی سرحد چیوں کہ ہندوستان کے ساتھ جڑی ہوئی ہے، اس لیے اس خطے نے بھی ہجرت و فسادات کے اثرات کو قبول کیا اور یہاں کے ادیبوں نے بھی ان موضوعات پر ناول لکھے۔ جن میں جمیلہ ہاشمی کا ناول ”تلاش بہاراں“ امجد جاوید کا ناول ” امرت کور“ اور شفیق احمد کا ناول ”دیا جلتا رہا“ قابل ذکر ناول ہیں۔

جمیلہ ہاشمی کا ناول تلاش بہاراں حقیقت میں کنول کماری ٹھاکر کی کوششوں اور جدوجہد کا استعارہ ہے۔ یہ ناول آزادی سے کچھ پہلے کے زمانے کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں ہندوستان کی تہذیب، ثقافت، جغرافیہ اور سیاست کی شکست وریخت کے ساتھ ساتھ از سرِ نو تعمیر و ترقی کی طرف گامزن ہونا مقصود ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس دور کے دوسرے ناولوں کی طرح اس ناول کا موضوع جنگ آزادی اور تقسیم ہند سمجھا گیا۔ نیلم فرزانہ لکھتی ہیں:

"تلاش بہاراں میں آزادی کے پہلے کے حالات وواقعات کو بیان کیا ہے۔جب سارے ہندوستان میں آزادی کی تڑپ پیدا ہو چکی تھی اور ملک میں بڑے پیمانے پر آزادی کی کوششیں جاری تھیں، لیکن اس دور کو پس منظر بناتے ہوئے جس امر پر زیادہ توجہ دی گئی ہے،وہ ہندوستانی معاشرے میں عورت کا استحصال اور مظلومیت ہے۔ جس میں کنول کماری ٹھاکر جدوجہد کا استعارہ ہے جو عورتوں کی بھلائی، ان کے حقوق کی حفاظت اور عورتوں کی عام ذہنی صور حال کو بدلنے کے لئے کوشش کرتی ہے،،(۱۰)

امرت کور بھی تقسیم ہند کے تناظر میں لکھا گیا ناول ہے جس میں ایک ایسی جنون خیز محبت کا تذکرہ ہے جو تقسیم ہندوستان کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔یہ محبت دو مختلف مذاہب کے افراد نور محمد اور امرت کور کے دلوں میں پروان چڑھتی ہے۔ امرت کور جو تقسیم ہندوستان سے پہلے جتھوال میں رہنے والے مسلم گھرانے کے نوجوان نور محمد سے پیار کر بیٹھی۔بظاہر یہ یک طرفہ محبت معلوم ہوتی ہے۔ جس طرح محبت سیلاب بلاخیز کی طرح عقل وخرد کو بہا لے جاتی ہے اور پورے وجود پر اپنا تصرف قائم کرتی ہے تو پھر یہ جسم سے ماوراء ہو کر روح کے نہاں خانوں میں صدا دیتی ہے۔ بلکل اسی طرح امرت کور اپنی ساری زندگی اس کے نام کر دیتی ہے لیکن تقسیم ہندوستان کی بدولت نور محمد کا پیار نہیں ملتا، تو وہ ہمیشہ کے لئے خاموشی اختیار کرتے ہوئے زندگی گزار دیتی ہے۔اس کے علاوہ اس ناول میں تقسیم ہند کے وقت عام آدمی کے مسائل اور سیاسی شعور کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔امجد جاوید نے تقسیم کے اثرات جو عام آدمی پر پڑے تھے ان کو یوں بیان کیا ہے۔

"اس ناول کا مرکزی موضوع محبت ہے۔ لیکن اس میں بے شمار تاریخی، سیاسی اور سماجی سچائیاں بھی موجود ہیں جو فرد واحد کے دل میں جنم لیتی ہیں اور وارفتگی کی منزلوں سے گزرتی ہوئی اپنے اندر عشق حقیقی کا رنگ اختیار کر لیتی ہیں"(۱۱)

ڈاکٹر شفیق احمد کا ناول" دیا جلتا رہا" میں بھی ہجرت کے مسائل کو بیان کیا ہے۔اس ناول میں دوسرے کئی موضوعات کے علاوہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد فسادات و ہجرت کے نتیجے میں ہونے والی تباہی کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کے. علاوہ پاکستان پہنچتے ہوئے ہجرت کے مسائل کا بیان بھی ملتا ہے۔اس ہجرت کے دوران انسانیت سوز حالات میں مذہب کے نام پر لاکھوں بے گناہ انسانوں کا قتل عام ہوا اور بے شمار انسانیت سوز واقعات پیش آئے

اس ناول میں علیم پاکستان پہنچنے کے بعد چودھری اسلم کو اپنی کہانی بیان کرتا ہے اور ہندوستان میں ہونے والے فسادات بیان کرتے ہوئے رو پڑتا ہے کہ کس طرح وہ اور اس کی بہن زینب پاکستان پہنچے۔ جب کہ اس کا باقی خاندان مار دیا گیا۔ علیم اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتا ہے:

> ”راستے میں صرف پھوپھی، زئنب اور میں ہی بچے باقی سب اسی طرح شہید ہو گئے جس طرح گاؤں میں سارا خاندان مارا گیا۔“(۱۲)

اس ناول کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری بہت سے اندوہناک واقعات سے گزرتا ہے اور فسادات کے دوران ہونے والی قتل و غارت گری کو دیکھتا ہے۔ قتل و غارت گری کے علاوہ دوسرا بڑا ظلم عورتوں کی عصمت دری تھا۔ ان فسادات کے دوران　　　لاکھوں عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ اس ناول کا اہم کردار رجی جٹی بھی اسی کرب سے گزرتی ہے جسے اس کے ہندو ہمسائے جنسی تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ رجی جٹی اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتی ہے :

> ”شریف تم دیر سے آئے۔ بہت دیر سے۔ یہ سب کمینے نکلے۔۔۔ سب کمینے۔۔ ہمسائے بھی اور ہانی بھی۔۔۔۔ ساری عمر میرا کھایا اور اب سب نے مجھے ہڈی پر لگی ہوئی بوٹی کی طرح چھوڑا۔ میں جب تک لڑ سکتی تھی لڑی۔ گھر اور خود کو آگ لگانے کی کوشش کی تاکہ کوئی مجھے چھو نہ سکے لیکن میں اکیلی تھی اور بدذات کئی۔ یہ جھوٹے بھی تھے اور مکار بھی۔“(۱۳)

تاریخی رجحان:

تاریخ نویسی ایک ایسا علم ہے جو معاشروں کے عروج و زوال میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ تاریخ دراصل قوموں اور معاشروں کے سابقہ اعمال کا وہ میزانیہ ہے جس کی بنیاد اور تجربے پر قومیں اور معاشرے آنے والے عہد کی راہیں متعین کرتے ہیں۔ یہ علم نہایت حساس اور دور اندیشی کا متقاضی ہے۔ تاریخ کے آئینے میں قومیں اور سماج اپنے چہرے دیکھ کر ان میں موجود خامیوں کو سنوارتے ہیں اور اپنا چہرہ مزید خوبصورت بناتے ہیں۔

سرزمین بہاول پور بھی ایک ایسا ہی خطہ ہے جس کی تاریخی حیثیت مسلمہ ہے۔ یہاں بسنے والے بہت سے مصنفین نے تاریخی واقعات کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ ان میں جمیلہ ہاشمی کے ناول ”چہرہ بہ چہرہ روبہ رو“ اور ”دشت سوس“ اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔

"چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو" کی کہانی قرۃ العین طاہرہ کی زندگی کے گرد گھومتی ہے۔ جس میں ایرانی معاشرت اور وہاں کی اخلاقی اقدار کا تذکرہ ہے۔

ناول کی ہیروئین ام سلمہ جس پر مختلف قسم کی پابندیاں لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ ایک گھریلو عورت کے دائرے سے نکل کر "بابی" عقیدے کے زیر اثر قراۃ العین طاہرہ بن جاتی ہے۔ قراۃ العین طاہرہ جو قزوین میں رہنے والے ایک مجتہد کی بیٹی ہے، وہ ایک اعلی تعلیم یافتہ اور منفرد لہجے کی شاعرہ تھی۔ وہ ہمیشہ انوکھے خواب دیکھا کرتی اور ہمیشہ ایک نادیدہ پردہ فروش کی آرزومند رہتی۔ وہ ہمیشہ فلسفیانہ انداز میں سوچتی۔ اس کشمکش میں وہ نجف کے عالم دین قاسم رشتی کو خط لکھتی ہے۔ قاسم رشتی اس سے بہت متاثر ہوتا ہے اور اسے ام سلمی سے قراۃ العین طاہرہ کا خطاب دیتا ہے۔ آخر کار ام سلمی قاسم رشتی کی پکار پر نجف پہنچ جاتی ہے۔ لیکن اس کے نجف پہنچنے سے پہلے قاسم رشتی فوت ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف قاسم رشتی کے پیروکاروں کو ایک رہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس دوران حسین بشروئی جو سید قاسم رشتی کا معتقد تھا، وہ شیراز آتا ہے۔ یہاں اس کی ملاقات محمد علی باب سے ہوتی ہے۔ ملا حسین بشروئی کچھ عرصہ کے بعد گرفتار ہو جاتا ہے اور ۹۰۳ھ میں انھیں بڑی بے رحمی سے مار کر دریا برد کر دیا جاتا ہے۔

"دشت سوس" بغداد کے صوفی حسین بن منصور حلاج کی زندگی اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ ناول دسویں صدی عیسوی کے عباسی دور کی سیاسی، سماجی اور مذہبی تناظرات کو پیش کرتا ہے۔۔

دشت سوس ایک حزنیہ ناول ہے، جس میں تاریخی شخصیت حسین بن منصور حلاج پر ہونے والے مظالم کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ مصنفہ نے اس ناول کو تین مختلف حصوں "صدائے ساز"، "نغمہ شوق" اور "زمزمہ موت" میں تقسیم کیا ہے۔

"صدائے ساز" میں منصور بن حلاج کے بچپن کے واقعات، تعلیم و تربیت اور روحانیت جیسے رجحانات کا تذکرہ ہے۔ "نغمہ شوق" میں منصور بن حلاج کو روحانیت کے طلسم میں گرفتار دکھایا گیا ہے۔ اور "زمزمہ موت" میں. منصور بن حلاج کا کنیز آغول کے ساتھ عشق کا تذکرہ ہے۔

حسین بن منصور ایک باغی انسان اور نئی روایت کا علمبردار تھا۔ وہ اپنے خیالات اور شاعری کی بدولت لوگوں کی فکر بدلنا چاہتا تھا۔ لوگ جوق در جوق اس کے پیروکار ہو رہے تھے۔ چنانچہ اس کی بڑھتی شہرت دیکھ کر حکومت خوفزدہ ہو گئی۔ چنانچہ حامد بن عباس نے ابن داؤد اصفہانی سے حسین بن منصور کے قتل کا فتوی لے کر

گرفتار کر لیا۔ بعد میں حسین بن منصور فرار ہو کر علاقہ خورستان (سوس) چلا گیا۔ ۳۰۰۱ء میں انھیں پھر گرفتار کیا گیا۔ ایک سال اس پر مقدمہ چلا۔ بعد میں انھیں بے دردی کے ساتھ قتل کیا گیا۔ جمیلہ ہاشمی حسین بن منصور حلاج کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ”جمیلہ ہاشمی نے "دشت سوس،، میں ایک درویش صفت حسین بن منصور حلاج کی زندگی کے واقعات کو بیان کیا ہے ان کی زندگی کے واقعات کے ساتھ ساتھ حکومت وقت کی طرف سے ان پر ڈھائے گئے مظالم کا تذکرہ ہے یہ ناول بیسویں صدی کے عباسی دور کو سیاسی، سماجی اور مذہبی تناظر کے ساتھ پیش کرتا ہے،،۔[۱۴]

روہی معاشرت کا رجحان:

ریاست بہاول پور پاکستان کے زرخیز اور خوش حال علاقوں میں شمار ہوتی ہے۔ تیرہ ہزار مربع میل پر پھیلی روہی یا چولستان نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس خطے کی تہذیب و ثقافت انفرادیت کے حامل ہے۔ جس نے مختلف ادیبوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ ان ادیبوں نے بے شمار نثر پارے روہی کی عظمت پر لکھے۔ ان میں جمیلہ ہاشمی، شفیق احمد، عمران اقبال اور. امجد جاوید خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے روہی جیسے ادبی ورثے کو ناول کے روپ میں پیش کیا۔ جمیلہ ہاشمی کا ناول ”روہی“شفیق احمد کا ناول ”دیا جلتا رہا“ عمران اقبال کا ناول ”مون سون“ اور امجد جاوید کا ناول ”عشق کا قاف“ زیادہ اہم ہیں۔

روہی بہاول پور کے مصنفین کا پسندیدہ موضوع ہے۔ جس کی مثال جمیلہ ہاشمی نے ”روہی“ کے نام سے ناولٹ لکھ کر پیش کی۔ اگرچہ یہ ناولٹ صوبہ سرحد کے پٹھانوں کے ایک گاؤں کے فطری پس منظر میں بیان کی گئی کہانی ہے۔ لیکن مصنفہ نے ناولٹ کے مرکزی کردار مریم کی خودداری اور پہاڑوں کے دامن میں بسنے والے گاؤں کی پوری تصویر کو روہی میں بسے ہوئے باسیوں کی زندگی سے جوڑ کر بیان کیا ہے۔ جس سے روہی میں بسنے والوں کے احساسات و جذبات، طرز زندگی، رہائش غرض ان کی پوری تہذیبی زندگی چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ اس میں مصنفہ نے اپنے مخصوص شاعرانہ اسلوب کے ساتھ ساتھ ماحول کی مناسبت سے تشبیہات کا بھی استعمال کیا ہے جیسے:

> ”ان کالی آنکھوں میں گہرے توے کی سی ٹھنڈک اور تاریکی تھی۔ میں نے اپنا چہرہ مریم کی آنکھوں کی سی کالی رات میں اوپر اٹھایا۔ بوندیں محبت بھرے بوسوں کی طرح میری

آنکھوں کے پپوٹوں پر، ہونٹوں کے کناروں پر، رخساروں اور ریت سے اٹے بالوں پر پڑنے لگیں۔ ،،(۱۵)

امجد جاوید کا ناول ’’عشق کا قاف‘‘ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امجد جاوید نے ’’عشق کا قاف‘‘ میں روہی کے باسیوں، جاگیرداروں، وڈیروں اور پیروں کے بے جا تسلط اور ناروا سلوک کو بیان کیا ہے۔ ’’عشق کا قاف‘‘ اگرچہ رومانوی کہانی ہے، لیکن مصنف نے روہی میں پائی جانے والی قبیح رسموں جیسے "وٹہ سٹہ،، اس رسم کے تحت ایک دوسرے سے رشتہ لیا اور دیا جاتا ہے۔ سانول اور مہرو اس قبیح رسم کی بھینٹ چڑھتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں، لیکن سانول کی کوئی بہن نہ ہونے کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے شادی نہیں کر سکتے۔ بالآخر سانول مہرو کو بھگا کر لے جاتا ہے لیکن وہ روہی کے وڈیرے پیر سیدن شاہ کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ پیر سیدن شاہ کے خوف کی وجہ سے پوری بستی میں سے کوئی اس کا جنازہ پڑھنے نہیں آتا۔ مصنف لکھتا ہے:

’’رب نواز اس وقت پیر سیدن شاہ کی تحویل میں ہے۔ پیر سیدن شاہ کے ڈر سے بستی کے لوگوں نے سانول کا جنازہ بھی نہیں پڑھا۔ اسے دفنانے بھی چند لوگ ہی گئے۔ یہ بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ پیر سیدن شاہ نے ایسے ناجانے کتنے قتل کروائے ہیں،، (۱۶)

پیر سیدن شاہ جیسے بے شمار کردار اس معاشرے میں موجود ہیں۔ جو غرباء کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں۔ انہیں کمی، کمین سمجھتے ہوئے انھیں بنیادی ضروریات سے محروم رکھا جاتا ہے۔ سارا دن ان سے ذاتی کام لئے جاتے ہیں۔ انکار پر یا کم کام کرنے کی صورت میں سزاوار ٹھہرایا جاتا ہے۔ انھیں تعلیم سے بھی اس لئے دور رکھا جاتا ہے کہ کہیں ان میں شعور نہ آجائے۔

جب علی روہی کے گاؤں میں مدرسہ بنانے کی کوشش کرتا ہے تو وڈیرہ شاہی کا ایک اور روپ سامنے آتا ہے اور علی کو ہتک آمیز لہجے میں گاؤں چھوڑنے کا کہا جاتا ہے۔

ناول نگار نے روہی جیسے پسماندہ علاقوں میں وڈیرہ شاہی کی مخصوص ذہنیت کو موضوع بنایا ہے۔ کہ اگر اس گاؤں میں کوئی سکول یا مدرسہ کھل گیا تو لوگوں میں کہیں شعور نہ آجائے۔ اس ڈر سے وہ اس گاؤں میں کوئی مدرسہ نہیں بننے دیتے۔ پیر سیدن شاہ، علی سے مخاطب ہے:

"علی تم جانتے نہیں ہو کہ تم کیا کر رہے ہو۔ تمھارا اگر کوئی منصوبہ ہے تو یہاں نہیں چلنے والا۔ تم لوگوں کو ورغلا تو سکتے ہو، لیکن ہمارے خلاف نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہم تمھیں ایک دن کی مہلت دیتے ہیں کہ یہاں سے دفع ہو جاؤ، ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔"(۱۷)

عمران اقبال کا ناول "مون سون" روہی کا نمائندہ ناول ہے۔ جس میں اس نے صحرائے چولستان کے باسیوں کی طرز زندگی کو بیان کیا ہے۔ جو دنیاوی خواہشات سے بے نیاز اپنے انداز میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو اپنی تمام تر محرومیوں کے باوجود پر سکون زندگی گزارتے ہیں۔ جو دنیاوی خواہشات سے بے نیاز اپنے انداز سے زندگی گزارنے کے عادی ہیں تمام بنیادی ضرورتوں سے محروم ہونے کے باوجود وہ پر سکون زندگی جینے کے خواہش مند ہیں، لیکن سرمایہ دارانہ نظام اور طبقاتی تقسیم کے اثرات روہی کے باسیوں کی زندگی بھی تباہ کر دیتے ہیں۔ جب کوئی وڈیرہ وہاں کی ثقافت اور تہذیب کو اپنے جوتے کی نوک پر رکھنے کی کوشش کرتا ہے تو وہاں کے باسیوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ عمران اقبال مون سون کے بارے میں اپنا نقطہ نظر یوں بیان کرتے ہیں۔

"مون سون صحرائے چولستان کے پس منظر میں لکھا گیا ایک ناولٹ ہے۔ جس میں اس خطے کی تہذیبی اور ثقافتی حقیقتوں سے پردہ چاک کیا ہے۔ چولستان کے ساتھ میری ذہنی اور جذباتی وابستگی میرے پڑھنے والوں سے پوشیدہ نہیں،،(۱۸)

حوالہ جات

۱۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، "اردو ناول کی تاریخ و تنقید"، مکتبہ لائبریری، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۴۶

۲۔ یوسف سرمست، ڈاکٹر، "بیسویں صدی میں اردو ناول"، نیشنل بک ڈپو، مچھلی کمال، حیدر آباد، ۱۹۷۳ء، ص ۹۶

۳۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، "برصغیر میں اردو ناول"، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۹۲

۴۔ محمد خان اشرف، ڈاکٹر "ادب کی ایک کارآمد اور مربوط تعریف"، مشمولہ، سالنامہ الحمرا، لاہور، جلد نمبر ۱۸، شمارا نمبر ۰۹، ستمبر ۲۰۱۸، ص ۳۴

۵۔ اطہر پرویز، "ادب کا مطالعہ"، اردو گھر، علی گڑھ، ۱۹۶۶ء، ص ۴۲

۶۔ نجم الدین احمد، "سہیم"، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۱۴۶

۷۔ نجم الدین احمد، "مدفن"، بک ہوم، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۵۷

۸۔اشفاق احمد ورک،ڈاکٹر،’’تبصرہ‘‘، محمد خالد اختر،مشمولہ،سال نامہ،فنون،لاہور،۱۹۸۵جولائی تا اگست،۱۹۸۸ء،ص ۱۵۰

۹-امیر عجم ملک،’’سرد معبد‘‘،الحمد پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۴ء،ص ۱۶۳

۱۰-نیلم فرزانہ،’’اردو ادب کی خواتین ناول نگار‘‘، فکشن ہاوس،لاہور،اشاعت دوئم،۲۰۱۷،ص ۲۵۸

۱۱-امجد جاوید،’’امرت کور‘‘،علم و عرفان پبلشرز،لاہور،۲۰۱۳ء،ص ۳۵

۱۲-شفیق احمد،ڈاکٹر،’’دیا جلتا رہا،،‘‘،علی برادرز پرنٹرز،لاہور،۲۰۰۶،ص ۴۵

۱۳۔ایضا،ص،۲۵

۱۴-۔جمیلہ ہاشمی،’’روہی پر تبصرہ‘‘،مشمولہ،رسالہ نیا دور کراچی،شمارہ نمبر ۴۱، ۴۲، ۲۰۰۲ء،ص ۲۸

۱۵-ایضا،ص ۸۴

۱۶-مجد جاوید،"عشق کا کاف،،علم و عرفان پبلشرز،لاہور،۲۰۰۹،ص ۸۵

۱۷'ایضا،ص ۱۸۱

۱۸۔عمران اقبال،’’مون سون،پیش لفظ،‘‘،علم و عرفان پبلشرز،لاہور،۲۰۰۶،ص،۵